Clash of Creative Process:Fictional Poetics Of Khalid Sohail Malik:Analytical Studies (In The Perspective of"Moon Soon")

تخلیقی عمل کی کشمکش:خالد سہیل ملک کی افسانوی شعریات:تجزیاتی مطالعہ

("مون سون" کے تناظر میں)

Mansoor Khan *1
Lecturer, Department Of Urdu, Government Post Graduate College, Charsadda
Dr. Jalwa Afreen Yousuf Zai*2
Lecturer, Department Of Urdu,Girls Cadet College Mardan
Saqib Ali*3
PhD Scholar, Department Of Urdu, Islamia College University Peshawar

1☆**منصور خان**

لیکچرار، شعبہ اردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج، چارسدہ

2☆**ڈاکٹر جلوہ آفرین یوسف زئی**

لیکچرار اردو، گرلز کیڈٹ کالج، مردان

3☆**ثاقب علی**

پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اردو، اسلامیہ کالج یونیورسٹی، پشاور

Correspondance: mansoorsahil.urdu@gmail.com

eISSN:**3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

Received: 15-07-2025
Accepted:12-09-2025
Online:29-09-2025

Copyright:© 2023 by the authors. This is an access-openarticle distributed under the

ABSTRACT: The 21st-century human is grappling with a new kind of existential crisis. In this post-modern era, where the idols of old beliefs have shattered, new pillars of meaning have yet to be constructed. In this intellectual vacuum, humans have become estranged from their own existence. The human mind has now transformed into a labyrinth from which the recovery of identity seems impossible. This internal turmoil is no longer merely a problem of psychological complexes an intellectual crisis that has affected all currents of human thought. The anguish of modern man is also prominently reflected in his art.In this context, creative writers like Khalid Sohail Malik have not merely depicted external events but have made this existential anxiety the center of their creations. His stories are, in fact, an artistic expression of modern man's search for meaning. In his works, this internal conflict transforms

terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

into an artistic flexibility that not only compels the reader to think but also shows them a path to unravel the mysteries of their own being.His art is essentially an identity map of this era, serving as a means to understand the psychological, social, and existential layers of modern humans. This is why his works are not only read but also pondered upon, as they are documents of our collective unconscious.The twenty-one stories included in Khalid Sohail's fictional collection "Monsoon" hold a unique literary status. Their fundamental merit is that they not only immediately captivate the reader but also begin to narrate their own autobiography, as if these stories are telling the tale of the reader's own experiences and emotions.Overall, Khalid Sohail Malik's stories, through their unique metaphors, introduce us to a new world of action and reaction. It is a world that seems restless to unravel the infinite layers of events. Here, an idea is born from the story; the idea creates meaning, and meaning leads to acceptance. This acceptance gives rise to human dynamism and skepticism, which continuously raises questions. One question gives birth to another, and this sequence constructs a new intellectual world. .

KEYWORDS:Short Story, Twenty First Century,Post modernism, Absurdity, Strange, Human Identity,Social Crises.

اکیسویں صدی کا انسان ایک نئے قسم کے وجودی بحران سے دوچار ہے۔ جدیدیت کے بعد کے اس دور میں جہاں پرانے یقین کے بت ٹوٹ چکے ہیں وہاں نئی معنویت کے ستون بھی تعمیر نہیں ہو سکے۔ اس علمی خلا میں انسان خود اپنے ہی وجود سے بیگانہ ہو کر رہ گیا ہے۔انسانی ذہن اب ایک ایسی بھول بلیلاں میں تبدیل ہو چکا ہے جہاں شناخت کی بازیافت ناممکن نظر آتی ہے۔ یہ داخلی انتشار محض نفسیاتی کمپلیکس کا مسئلہ نہیں رہا، بلکہ ایک ایسی علمی بحران بن چکا ہے جس نے انسانی سوچ کے تمام دھاروں کو متاثر کیا ہے۔ جدید انسان کی یہ تڑپ اس کے فن میں بھی نمایاں ہوئی ہے۔اس تناظر میں خالد سہیل ملک جیسے تخلیق کاروں نے محض خارجی واقعات کی تصویر کشی نہیں کی بلکہ اس وجودی بے چینی کو اپنی تخلیقات کا مرکز بنایا ہے۔ ان کی کہانیاں دراصل جدید انسان کی معنویت کی تلاش کا ایک فنکارانہ اظہار ہیں۔ ان کی تخلیقات میں یہ داخلی کشمکش ایک ایسی فنکارانہ لچک میں تبدیل ہو جاتی ہے جو قاری کو نہ صرف سوچنے پر مجبور کرتی ہے، بلکہ اسے اپنے وجود کے اسرار تک پہنچنے کا راستہ بھی دکھاتی ہے۔

ان کا فن دراصل اس دور کا ایک ایسا شناختی نقشہ ہے جو جدید انسان کی نفسیاتی، سماجی اور وجودی پرتوں کو سمجھنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات نہ صرف پڑھی جاتی ہیں بلکہ ان پر غور و فکر کیا جاتا ہے کیونکہ یہ ہمارے دور کے اجتماعی لاشعور کی دستاویز ہیں۔ خالد سہیل کے افسانوی مجموعہ "مون سون" میں شامل اکیس افسانے اپنی ایک منفرد ادبی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان افسانوں کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ یہ نہ صرف قاری کو فوری طور پر اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں بلکہ اسے اپنی ہی سرگزشت سنانے لگتے ہیں، جیسے یہ افسانے اس کے اپنے تجربات اور جذبات کی کہانی کہہ رہے ہوں۔

اگرچہ ادبی اصول یہ کہتا ہے کہ افسانہ زندگی کے محض ایک پہلو یا ایک جھلک کو پیش کرتا ہے لیکن خالد سہیل کے ہاں یہ بات یکسر مختلف نظر آتی ہے۔ ان کے افسانوں میں زندگی اپنی تمام تر وسعت گہرائی اور متنوع کیفیات کے ساتھ سمٹ آئی ہے۔ وہ محض واقعات بیان نہیں کرتے بلکہ انسانی وجود کے مکمل نقشے کو تخلیقی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ خالد سہیل ملک کی اس فکری عظمت اور ان کے افسانوں میں زندگی کی مکمل تصویر کشی کی تائید معروف ناقد ڈاکٹر رشید امجد نے ان الفاظ میں کی ہے:

> "خالد سہیل کی سب سے بڑی متاع ان کے افسانوں کی وہ پر اسرار کشش ہے جو قاری کو پہلی سطر ہی سے گرفت میں لے لیتی ہے۔ ان کی پوری کہانی دو سطحوں پر مسحور کن اثرات رکھتی ہے۔ اول اس کی خارجی پرت جو اپنے سماجی ماحول میں گندھے مسائل و معاملات، خواب و خواہش کے اثرات میں سے اپنی موضوعاتی پہچان کراتی ہے۔ دوم اس ظاہری کہانی میں چھپی بلکہ سرایت کرتی ایک دکھائی نہ دینے والی اسراریت جو قاری کو ہمہ وقت اپنی گرفت میں لیے رکھتی ہے۔"(۱)

خالد سہیل کے افسانے روایتی موضوعات جیسے رومانوی محبت، عاشقانہ وصال، بے قراری یا محبوب کی بے وفائی، اور حاکم و محکوم کے مابین ظلم و ناانصافی سے ہٹ کر ایک نئے افق پر کھلتے ہیں۔ وہ ملک کائنات انسانی زندگی اور تیسری دنیا کے مسائل پر گہری فلسفیانہ نگاہ ڈالتے ہیں اور اپنے خیالات کو ایک الہامی اور شاعرانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ افسانہ "مون سون سے مون سون تک" ایک شفاف اور پر تاثیر بیانیہ پیش کرتا ہے جس میں واقعات کی باریکیاں قاری کو ساحل سمندر پر بسنے والے حساس اور بے بس لوگوں کی داخلی کیفیات سے روشناس کراتی ہیں۔ یہ افسانہ ایک ایسے کردار "رام اوتار" کی کہانی سناتا ہے جو اپنی خوشیوں سے بھی محروم ہے۔ ایک ایسی نفسیاتی تصویر جو انسانی محرومیوں اور سماجی حقائق کے نئے پہلوؤں کو عیاں کرتی ہے۔

> "آج پھر چاکرا کے ساحل کے اوپر تنے ہوئے آسمان کی نیلاہٹوں کو گھنیرے بادلوں نے اپنی اوٹ میں چھپا لیا تھا۔ رام او تار ویسے ہی ساحل کی ٹھنڈی ریت پر بیٹھا، ہوا کی ناریل اور پام کے درختوں کے ساتھ زور آزمائی کو

انجاک سے دیکھ رہا تھا۔ آخری دھواں کھینچ لینے کے بعد اس نے بیڑی کو وہیں ساحل کی نرم ریت میں دفن کر دیا، اور اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی رام دئی ے بولا "اری ناشکری عورت! مون سون ہمیں کیا نہیں دے گیا۔ وہ تو ہمیں ہمارا جیون دے گیا ہے۔ جیون اٹھو کٹیا میں سے مون سون کو اٹھا باہر لے آؤ۔ وہ جاگ چکا ہو گا۔"(۲)

"موسم جب بدلتا ہے" کا آغاز غلام عباس کے "اور کوٹ" کی یاد دلاتا ہے۔ خالد سہیل ملک اس کردار کا تعارف کچھ یوں کرتے ہیں:

"اس نے اپنا سرخ رنگ کا Cerruti کا مفلر اپنے چہرے سے ہٹا کر y s l کے مسٹر ڈکلر کے اور کوٹ کے بٹن کو کھول دیے تھے۔ اوور کوٹ کے نیچے اس نے Raulflauren کے ٹو پیس سوٹ کے کوٹ کی اندرونی جیب میں سے سگار باکس نکال کر اس میں سے ایک ہوانا سگار نکالا اور سگار کو ایک طرف سے دانتوں میں چبا کر منہ میں رکھ لیا تھا"(۳)

یہ افسانہ ایک ایسے جدید انسان کے کردار کو مرکز میں رکھتا ہے جو اپنی تمام تر پیچیدگیوں کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے۔ کہانی کا آغاز ایک بار میں داخل ہونے والے ایک ادھیڑ عمر شخص سے ہوتا ہے اور پھر ریسٹورنٹ میں کمار نامی کردار سے اس کی ملاقات تک کے واقعات بظاہر انتہائی سادہ اور روزمرہ محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن کہانی جیسے جیسے رواں دواں ہوتی ہے یہ اپنے سطحی پردے کو چاک کر کے اچانک گہرے فکری اور فلسفیانہ دھارے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں تخلیق کار قاری و سامع کو محض ایک تماشا گر نہیں بناتا بلکہ اسے کہانی کے مرکز میں کھڑا کر کے وجود تعلق اور تنہائی جیسے بنیادی سوالات سے آمنا سامنا کرواتا ہے۔ ان سوالات کے جو نامکمل، کھلے اور مبہم نتائج سامنے آتے ہیں وہی اس تحریر کی اصل طاقت ہیں۔ وہ قاری کے ذہن میں ایک ایسا تجسس پیدا کرتے ہیں جو کہانی ختم ہونے کے بعد بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا بلکہ اسے اپنے بارے میں اور اپنے اردگرد کی دنیا کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

"نہ جانے وہ کتنی دیر تک اس شور میں بے سدھ پڑا رہا تھا۔ مگر اب اس کے اعصاب بالکل بھی تناؤ کا شکار نہ تھے۔ جب وہ اٹھا تو اس کا ہوانا سگار ایش ٹرے میں راکھ بن چکا تھا۔ گھر کے دروازے تک جب وہ پہنچا تھا تو ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ جسے نظر انداز کر کے اس نے باہر کا دروازہ کھول دیا تھا۔ باہر سڑک پر دھند کی حکمرانی تھی۔ اس نے اپنے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے محسوس کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا دروازے سے باہر نکلنے والا اگلا ایک

قدم اسے اس دھند کو ہا سونپ رہا تھا جو خد و خال کو بھی دھندلا دیتی ہے۔"(۴)

خالد سہیل ملک اپنی تحریروں میں روزمرہ زندگی کے عام واقعات اور کرداروں کو بھی ایک انوکھی اور خاص پرتوں میں پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ان کے افسانے "چاند سے ایک وعدہ" کا مرکز ایک ایسا ہی گھریلو ماحول ہے جسے مصنف نے اپنی منفرد بصیرت سے یکسر بدل دیا ہے۔ان کی تحریروں میں عورت کے داخلی اور نفسیاتی پہلوؤں کی گہری سمجھ واضح نظر آتی ہے۔ایک طرف رام دائی جیسی خواتین ہیں جو اپنی زندگی کے مقصد کو صرف اولا تک محدود سمجھتی ہیں تو دوسری طرف ایک ایسی باغی عورت کا تصور بھی موجود ہے جو روایتی معیارات سے بغاوت کرتی ہے۔وہ چاند کو گواہ ٹھہرا کر اپنے عزم کا اعلان کرتی ہے کہ وہ ماں بن کر رہے گی۔یہی نفسیاتی گہرائی ایک اور افسانے "اعتراف ذات" میں بھی دیکھی جاسکتی ہے جہاں مارگریٹ کا کردار اپنی ذات کے اعتراف اور زندگی کی سچی مسرت کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے۔اس بابت علی اکبر ناطق لکھتے ہیں:

"وہ روزمرہ کے ایسے معاملات سے کہانی کو کشید کرلیتے ہیں جہاں سے بڑے افسانہ نگاروں کا ظہور ہوتا ہے ۔ ایک معمولی بات سے وہ نفسیاتی گتھیاں سلجھاتے اور الجھاتے ہوئے افسانے کو نبھا جاتے ہیں۔بیانیہ اُلجھا ہوا ہرگز نہیں اور سب سے بڑھ کر وہ نصائح سے گریز کرتے ہوئے اور اپنی ذات کو پس پردہ رکھتے ہوئے کہانی لکھتے ہیں۔"(۵)

خالد سہیل ملک کے افسانوی سفر کا ارتقاء دو واضح سطحوں پر محیط ہے۔ سطح اول وہ بیرونی یا ظاہری عمل ہے جس میں معاشرتی تعمیر و تشکیل یعنی "اینٹ پر اینٹ رکھنے" کا پہلو نمایاں ہے۔جبکہ دوسری سطح انسانی ذہن کی گہرائیوں خاص طور پر لاشعور کی پراسرار دنیا میں نفوذ اور اس کی دریافت سے تعلق رکھتی ہے۔ان کا افسانہ "آئینہ در آئینہ" اسی لاشعوری کیفیات کے جہاں کو سامنے لاتا ہے جہاں کردار اپنی ہی لاشعوری خواہشات اور محرکات سے آزادی پانے کی ناکام کوشش کرتا نظر آتا ہے۔یہی داخلی جستجو اور کشمکش ان کی دیگر تخلیقات جیسے "جنوں کو فاصلہ ہی کتنا ہے۔۔" اور "کوانٹم کہانی"۔۔ میں بھی مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔

"شاید اس اطمینان کی وجہ یہ تھی کہ وہ جس منطقے پر موجود تھا وہاں آکسیجن موجود تھی یا پھر وہ آکسیجن سے ماوراء ہو چکا تھا۔ مگر کیسے؟ اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔اگر آکسیجن تھی تو اس منطقے پر حیات کیوں ہتھی؟ اور اگر حیات موجود نہ تھی تو وہ کیونکر زندہ تھا؟ اگلے چند لمحے بھی اس کے لیے عجیب تھے۔اس نے اپنے خلائی لباس کا تکیہ سا بنایا اور آسمان کی جانب منہ کر کے لیٹ گیا۔ حیرت انگیز طور پر وہ آسمان بالکل زمین کے آسمان جیسا مانوس

لگ رہا تھا۔ خاموشی، منظر کی وسعت اور خالی ذہن اسے عجیب سا سکون
فراہم کر رہے تھے۔ مگر اس عجیب و غریب کیفیت میں بھی اس کے دل میں
بالکل ویسے ہی شدید جذبات کیوں جنم لے رہے تھے جو اس نے برسوں پہلے
روتھ سے پہلی ڈیٹ پر محسوس کیے تھے۔"(۶)

یوں تو افسانوی ادب میں فطری تلازمات اور انسانی جبلت کی عکاسی کم ہی دیکھنے میں آتی ہے لیکن مون سون کے مجموعے میں شامل افسانہ "خوشبو کا لمس" اس معاملے میں مستثنٰی ہے۔ اس میں پیش کردہ تمام مظاہرِ فطرت اور انسانی کیفیات انتہائی حقیقت پسندانہ اور بے ساختہ محسوس ہوتے ہیں۔ افسانے کا پورا بہاؤ دو مرکزی کرداروں کے درمیان مکالموں سے تشکیل پاتا ہے۔ یہ مکالمے نہ صرف کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں بلکہ انسانی فطرت، پسندیدگی و ناپسندیدگی، جیت اور ہار کے جذبات، چاند کی رازداری، اور رات کے سحر انگیز مناظر کے ساتھ ساتھ فرد کے گہرے وجودی کرب کو بھی بے نقاب کرتے ہیں۔ مجموعے کا ایک اور اہم افسانہ، "عنوان سے عاری ایک کہانی" اپنے بے نام ہونے کے باوجود بے شمار معنوی عنوانات سموئے ہوئے ہے۔ یہ انسان اور حیوان کے درمیان کی متعین حدوں کو پار کرتا ہوا ایک ایسی کہانی بیان کرتا ہے جو انسانی اخلاقیات پر گہرے سوالات کھڑے کرتی ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار "لالی" جو ایک پاگل، معصوم، اور ذہنی منتشر کردار ہے۔ اس کے علاوہ مالک "مقصود الٰہی" کا کردار لالی کی معصومیت کو جنسی زیادتی کے ذریعے ہمیشہ کے لیے داغدار کر دیتا ہے معاشرے کی اخلاقی پستی کو ظاہر کرتا ہے۔ افسانے کا اختتام انتہائی المناک ہے جو معاشرتی لاپرواہی اور انسانی قدروں کے زوال پر ایک شدید طنز ہے۔

"کالونی والوں کی اب یہ پریشانی تھی کہ مقتولین کو کیسے ٹھکانے لگایا جائے۔
کیونکہ قاری عبد البصیر نے لالی کا جنازہ پڑھانے سے اس جواز کی بنیاد پر انکار
کر دیا تھا کہ الیکان وب معلوم نہیں۔ تب کالونی والوں نے چندہ اکٹھا کر کے
یوٹیلٹی والوں کو لاشیں ٹھکانے لگانے کا کام سونپ دیا تھا۔"(۷)

خالد سہیل ملک کا اسلوب ان کی تخلیقی بصیرت کا آئینہ دار ہے۔ ان کے افسانے اسلوب کی ہر جہت (اظہاری، بیانی، مکالماتی، معنیاتی اور جمالیاتی) کو اس مہارت سے سموتے ہیں کہ وہ ان کی تحریر کا امتیازی وصف بن جاتی ہے۔ ان کی تحریر میں روایتی افسانوی اسلوبیات اور جدید افسانے کی رمزیہ تکنیک کا ایک منفرد امتزاج پایا جاتا ہے۔ یہی ان کا اپنا ایک الگ اور منفرد اسلوبیاتی تشخص ہے۔

اجمالاً خالد سہیل ملک کے افسانے اپنے مخصوص استعاروں کے ذریعے عمل ورد عمل کی ایک نئی دنیا سے روشناس کراتے ہیں۔ یہ ایک ایسی دنیا ہے جو واقعات کی لامتناہی تہوں کو کھولنے کے لیے بے چین نظر آتی ہے۔ یہاں کہانی سے خیال جنم لیتا ہے خیال معنی کی تخلیق کرتا ہے، اور معنی قبولیت تک پہنچتے ہیں۔ یہ قبولیت انسانی تحرک و تشکیک کو جنم دیتی ہے جو مسلسل سوال اٹھاتی ہے۔ ایک سوال دوسرے سوال کو جنم دیتا ہے، اور یہ سلسلہ ایک نئی فکری دنیا کی تشکیل کرتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ڈاکٹر رشید امجد،فلیپ،مون سون،پشاور:جی ایچ پرنٹرز،۲۰۲۳،
۲۔خالد سہیل ملک،مون سون،پشاور:جی ایچ پرنٹرز،۲۰۲۳،ص:۲۲
۳۔ ایضاً،ص:۲۳
۴۔ ایضاً،ص:۳۰
۵۔ ایضاً،ص:۱۶
۶۔ ایضاً،ص:۸۶
۷۔ ایضاً،ص:۱۱۰

References:

1. Amjad, Dr. Rasheed. Flap, Monsoon. Peshawar: G.H. Printers, 2023.
2. Malik, Khalid Sohail. Monsoon. Peshawar: G.H. Printers, 2023, p. 22.
3. Ibid., p. 23.
4. Ibid., p. 30.
5. Ibid., p. 16.
6. Ibid., p. 86.
7. Ibid., p. 110.